تقدیم

انسان کو دو اموات کے مابین مقید، ایک حیاتِ متناہی عطا کر کے اس کرہء ارضی پر مبعوث فرمایا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔کیوں؟

یہ 'کیوں' پردہِ خیال پر ناچنے والی اِک ایسی پری ہے جو بے لباس و بے لگام ہو تو راغب الی المعصیت اور پردہ پوش ہو تو تشنہ خیالی کا سبب بن جاتی ہے۔ اِس کے لباس کا موزوں ہونا اُسی قدر ضروری ہے جتنا اُس کے بدن پر لباس کا ہونا۔ معصیت جب اپنی حدوں کو پھلانگ لے تو بغاوت بن کر ظاہر و باطن میں تلاطم برپا کر دیتی ہے۔ دُنیا میں متعدد طبقاتِ فکر اپنی وُسعتِ خیال و بساط کے تناسب سے اس محبوب و معشوق زندگی کو تصور میں ڈھال کر قرطاس پر منتقل کرتے رہے۔ وہ افراد جن کے شب و روز مادہ کی جستجو میں صَرف ہوتے ہیں، وہ مادی حقائق اور اُس کے متعلقات کے سمجھنے کو غایتِ زندگی قرار دے چکے۔ ابتدائی جماعتوں کی سائنس میں پڑھا تھا کہ مادہ تین ہی حالتوں میں موجود ہوتا ہے، ٹھوس، مائع اور گیس۔ اِن تین حالتوں میں موجود، موجودات، مذکورہ طبقہ فکر کے ہاں اصل الاصول ہوں گے اور دیگر تمام مسئلہ ہائے زندگی اگر اپنی وقعت قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اِن سے اپنے تعلق کی وضاحت کے پابند ہوں گے۔ اہلِ علم طبقات اجسام اور اُن کے متعلقات کی علمی وضاحت اور اس پر دروبینی کو مقصدِ حیات مانتے ہیں۔

اُستاد نے اس دور میں کیا علم پڑھایا
مادہ کے تخیل کا خریدار بنایا
نے رُوح جو پابندِ نباتات و جمادات
مت بحث میں لا اس کو کہ نہ ٹھوس نہ مائع

شعبۂ فنون سے متعلق افراد نے زندگی کو سٹیج اور اُس پر ادا کیے جانے والے مختلف کرداروں کی سرگزشت جانا جس کا حقیقت سے دُور دُور کا تعلق نہیں بلکہ محض 'اک خواب اور خوابِ پریشاں ہے'۔ الغرض ہر ایک نے زندگی کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور کسی متعین سمت میں دیکھا، تانگے میں جُتے اس گھوڑے کی طرح جس کی آنکھوں پر موجود گاگل اُس کی نگاہوں کو سڑک کی دائیں اور بائیں جانب کی موجودات سے بے بہرہ رکھتی ہے۔

چار اندھوں کی مشہور کہانی تو آپ نے سُنی ہوگی جو ہاتھی دیکھنے جاتے ہیں۔ ایک اندھے کے ہاتھ میں ہاتھی کی دُم، دُوسرے کے ہاتھ میں اُس کی سُونڈ، تیسرے کو اُس کا جسم اور چوتھے کو اُس کے کان پکڑائی دیتے ہیں۔ پہلے اندھے کے خیال میں ہاتھی رسی جیسا، دوسرے کے خیال میں درخت کے تنے جیسا، تیسرے کے خیال میں چٹان جیسا اور چوتھے کے خیال میں پنکھے جیسا ہوتا ہے۔ خاکم بدہن آج ہم بھی اس زندگی کے بارے میں ایسی ہی وُسعتِ نظر و خیال رکھتے ہیں۔ رہی بی زندگی، تو وہ خیالات و افکار کے اس پُر تنوع اور رنگین کینوس پر اپنا اصل رنگ تلاش کرنے کی متمنی ہے۔

زندگی ہے تلاش میں شاید
دیکھتا ہوں بھٹک رہی در در
یہ نہیں تھی کبھی مری غایت
آ نکل جسم سے، اے دیدہ ور
چھین لے کچھ جہان سے فرصت
روح کے سنگ ہو کچھ وقت بسر

ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ کی کتاب 'اسلام کی نشاۃ ثانیہ۔ کرنے کا اصل کام' کے آغاز ہی میں ایک جُملہ پڑھا تھا جو آج بھی ذہن کے کسی گوشے پر چسپاں ہے۔

'انسان کے ذہنی اور فکری سفر کے دوران ایک نقطہ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پر اس پورے فکر کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ، اِس میں خیال اور ماورائی تصورات کی بجائے ٹھوس حقائق اور واقعات کو غور وفکر اور سوچ و بچار کا اصل مرکز ومحور ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور خدا کے بجائے کائنات، روح کے بجائے مادہ، اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصور کی بجائے حیاتِ دنیوی کو اصل موضوع بحث قرار دیا گیا ہے' (اسلام کی نشاۃ ثانیہ۔ کرنے کا اصل کام۔ ص نمبر ۵)۔ المختصر انسان کے فکری ارتقا کے نتیجے میں وجود میں آنے والے اِس تصور، جس میں خالقِ کائنات کو عملی طور پر مادہ سے، رُوح کو جسد سے اور آخرت کو دُنیا سے replace کرنے کی جو جسارت کی گئی، وہ راقم الحروف کی رائے میں انسان کیلئے نہ صرف نظریاتی سطح پر ایک مُہلک تبدیلی ہے بلکہ عملاً کہیں، خاکم بدہن، دنیا کو ایک ایسے منج پر نہ لا کھڑا کرے کہ، قبل از انجام، خلقِ خدا، قیامت برپا کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

ابداعِ عالم سے آج کے گلوبل ورلڈ آرڈر تک نظریات کا یہ تصادم نوشتہ دیوار رہا ہے لیکن اِس دور میں یہ پوری شدت کے ساتھ تمام شعبہ ہائے زندگی میں مختلف اشکال میں جلوہ افروز ہوا۔ احوالِ ظاہری میں، مادی نظریات کے حاملین اپنے نظریات کا رنگ زندگی کے تمام گوشوں پر چڑھا چکے اور مقصدِ زندگی طے کرنے میں کارفرما عوامل اسی فلسفہ سے اصطلاحات مستعار لیتے نظر آتے ہیں لیکن آج بھی کہیں کسی نیم مرئی گوشے سے کبھی کبھار کوئی نحیف سی آواز ضرور سُنائی دیتی ہے جو وقت کے شور میں یا تو گُم ہو جاتی ہے یا اس قدر اجنبی معلوم ہوتی ہے کہ اُسے نظریاتی سطح پر قلیل اقلیت قبول کر بھی لے، عملاً اُسے ناقابلِ ترویج ہی سمجھا جاتا ہے۔ نظریات کے تقابلی مطالعے سے شغف رکھنے والے راقم سے اتفاق کریں گے کہ حق جتنی بھی نحیف آواز میں ہو، اُس کی حقانیت پر کوئی آنچ نہیں آتی۔

ایسے میں کتابِ ہٰذا 'میری زندگی کا مقصد' بھی انسانی زندگی کا مقصد اُس کے موجود مدارج میں تلاش کرنے کی ایک ادنیٰ سی سعی ہے۔ زندگی کے مقصد کے تعین کیلئے اس امر کو ضروری سمجھا گیا کہ موجودہ تصورات ونظریات کا جس قدر ممکن ہو ایک جائزہ لیا جائے اور

محاورہءوقت(idiom of the time) میں اُس کو پیش کیا جائے۔

اک چراغِ لالہ لے کر ڈھونڈتا تھا نامہ بر
تھا پیامِ عرش میرے نام، مجھ سے بات کر
وہ زماں کا سعد جس کا نام اکثر ہر سنا
ہے شکایت کا ترنم اس کے بچھڑے ہونٹ پر

ملا اک شب میں فرعونِ مصر کو
ملا بیٹے کو پہلے پھر پدر کو
نہ تھا نادم کوئی اپنے کیے پے
چھپاتا باپ تھا اپنے پسر کو

زندگی کے مقصد کے تعین کیلئے نظم 'مقصدِ حیات' کو مرکزی نظم کی حیثیت حاصل ہے اور یہ نظم راقم الحروف کے فکری ارتقا کو پیش کرنے کی ایک سعی ہے۔ 'شکایت' اور 'میدانِ محشر' سے اس نظریہ کو تقویت دینے والے عوامل کی داستان ہے۔

ہر رات اپنے رب سے ہُوں خلوتوں میں گویا
میں طالبِ ہدایت میر ا شعو ر سویا
سجدے میں سر گِرا لُوں یہ تو مجھے خبر ہے
پر فکر میں جہالت کا بیج ہم نے بویا

معنوی اعتبار سے کتاب میں موجود نظمیں کہیں سوال و جواب کی شکل اور کہیں داستان کی شکل میں افکار کا تقابل اور کہیں محبت کو مختلف اسالیب سے عنوان کیے ہوئے ہے۔

کلام میں موجود تمام خوبیاں اللہ کی عنایت ہیں جن پر راقم اللہ کے حضور سجدۂ شکر بجالاتا ہے اور تمام نقائص خاکسار کے نفس کی شرارت ہیں جن پر قارئین سے معذرت خواہ ہوں۔

یہ کہانی پڑھ کے سو جائیں گے سب اہلِ وطن
سب کہانی بن نہ جائیں اس ستمگر دار پر

ڈاکٹر محمد شاہین سعد تنولی